انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۱۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۸ ؍ اپریل ۱۹۶۷ء

اداریہ

جن سنگھ اور اردو

بہار میں کانگریس کی مخالف جماعتوں نے جو مشترک وزارت بنائی ہے، وہ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنانا چاہتی ہے، چنانچہ گورنر کے ایڈریس میں اور وزارت کے پروگرام میں اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے کا ذکر ہے۔ مگر جن سنگھ جو اس مشترک وزارت کے ساتھ ہے، اردو کے معاملے میں [illegible] اور اس کے لیڈروں نے کہا ہے کہ وہ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں۔ حال میں رسالہ ہندوستان میں جو [illegible] والوں کی طرف سے شائع ہو رہا ہے، شری بلراج مدھوک کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اردو کے متعلق وہی پرانی اور بے سروپا باتیں دہرائی ہیں جن کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے اور جن کا کھوکھلا پن اچھی طرح آشکار ہو چکا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جن سنگھ نے اپنے ذہن کو اتنا محدود کر لیا ہے کہ بعض حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی آج بھی اس میں سکت نہیں ہے۔

جن سنگھ والے یہ کہتے ہیں کہ اردو کوئی علیحدہ زبان نہیں ہے یہ ہندی کا ایک اسلوب ہے۔ انھیں یہ بھی شکایت ہے کہ مسلمان اس کی کیوں حمایت کرتے ہیں۔ وہ اس کے رسم خط کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن سنگھ حقائق پر غور نہیں کرتی بلکہ اس کا پہلے سے طے شدہ ایک نقطۂ نظر ہے اور وہ سب پر یہ نقطۂ نظر لادنا چاہتی ہے۔

اردو ایک آزاد، خود مختار اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ بلاشبہ یہ کھڑی بولی سے نکلی ہے جس سے ہندی نکلی ہے لیکن ایک چشمے سے دو دھارے پھوٹ سکتے ہیں اور پھوٹتے ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ جدید ہندی سے زیادہ پرانی ہے اور عہد بعہد کے چلن اور ارتقا کی کہانی رکھتی ہے۔ آج بھی اس کے پیچھے چلن کی طاقت ہے اور اس کا ایک شاندار ادب ہے۔ اس کا رسم خط جو شروع سے اس کے لیے استعمال ہو رہا ہے، وہ رسم خط ہے جس کی بنیاد اگرچہ فارسی رسم خط پر تھی مگر جس میں ہندی آوازوں کو شامل کر کے اب اسے ہندوستانی بنا لیا گیا ہے اور اب اسے اردو رسم خط ہی کہنا چاہیے لیکن یہ رومن اور دیوناگری میں بھی لکھی جاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی یہ مشورہ دے کہ اردو کی کتابیں رومن یا دیوناگری میں بھی چھاپی جائیں تو ہم اس مشورے کو سراہیں گے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ اردو کا رسم خط بدل دیا جائے تو ہم اس کی مخالفت کریں گے۔ زبان کے ساتھ رسم خط کا بنیادی تعلق نہیں مگر تاریخ اور تہذیب اور جذبے کا تعلق ہے۔ اس لیے علمی اسلوب سے کسی رسم خط کی خوبی یا خامی پر غور کرنا اور بات ہے اور اردو والوں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ دیوناگری اختیار کر لیں بالکل دوسری بات۔ مدھوک صاحب یہ مشورہ تامل ناڈو والوں کو دے کر دیکھیں۔ ہمارے دستور نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ہر اقلیت کا رسم خط [illegible] محفوظ ہے۔ اردو اقلیت کو اختیار ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لیے ضروری اقدامات کرتی رہے۔ رہا یہ سوال کہ مسلمان اس کی کیوں حمایت کرتے ہیں یا اس کے لیے تحفظ چاہتے ہیں۔ تو یہ بھی خالص قومی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ مسلمان بھی ہندوستانی قوم کا ایک عنصر ہیں۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ وہ تو ان تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے جنھوں نے ماں کی گود میں آنکھ کھولتے ہی اس کی مٹھاس چکھی۔ لیکن اگر مسلمان جو ہندوستانی قوم کا ایک اہم عنصر ہیں، کسی زبان کی حفاظت کے لیے آواز بلند کرتے ہیں تو یہ قوم کی ایک اہم جماعت کی آواز ہے اور اس طرح قومی آواز ہے۔ اسے فرقہ پرستی کہنا خود فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہر زبان میں مختلف مذاہب کے رنگ اور تعلیمات کا ذخیرہ ہوتا ہے اور جس طرح ہر مذہب کے پرچار کا ہمارے ملک میں اختیار ہے، اسی طرح ہر زبان ایک قومی حیثیت رکھتی ہے خواہ اس کے بولنے والوں یا اس سے محبت رکھنے والوں میں کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی کم۔ ہندی زبان بولنے والوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے مگر ہندی صرف ہندوؤں کی زبان نہیں ہے یعنی ہندی کا تعلق ہندو مذہب سے نہیں۔ بنگالی بولنے والوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، مگر بنگالی کا تعلق صرف ہندوؤں سے نہیں مسلمانوں سے بھی ہے۔ اسی طرح اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا یا

اس پر فرقہ پرستی کا الزام لگانا سراسر بے معنی بات ہے۔ یہ قومی زبان ہے اس حیثیت سے دستور کے آٹھویں شیڈول میں اس کا ذکر ہے۔ اس کے بولنے والے ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق بھی دو کروڑ ۳۰ لاکھ ہیں گو دراصل یہ تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ چونکہ بیس برس کے تجربے سے یہ بات ثابت ہوتی کہ جو سہولتیں اب تک اردو کو دی گئیں ان پر عمل نہیں ہوا بلکہ اس کے چلن اور اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی گئیں، اس لیے اب اردو والوں کا یہ مطالبہ فطری ہے کہ دستور کے مطابق جہاں اردو والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے وہاں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ یہ ایک قومی مطالبہ ہے۔ جن سنگھ جو ایک بڑی سیاسی پارٹی ہے اور جو قومی نقطۂ نظر رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اسے ایمانداری کے ساتھ سارے مسئلے پر پھر سے غور کرنا چاہیے اور فرقہ پرستی کو ترک کرکے قومی نقطۂ نظر سے اقلیتوں کے ساتھ انصاف ہی نہیں بلکہ فیاضی کا سلوک کرنا چاہیے۔ جن سنگھ اقلیتوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی، جمہوریت کے اصولوں کا احترام کرنے کی، دستور کی اسپرٹ پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ اپنا ایک مخصوص فلسفہ اور پروگرام سب پر لادنا چاہتی ہے جس میں یقیناً بہت سی مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنی انفرادیت کھو دیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ان باتوں سے فاشیت کی بو آتی ہے۔ اردو کے سلسلے میں جن سنگھ کو اپنے نظریے پر نظر ثانی کرنا چاہیے اور ان سیاسی پارٹیوں کا ساتھ دینا چاہیے جو اس کے قومی رول کو تسلیم کرکے اس کے چلن اور اس کی ترقی کے لیے تمام آئینی اور جمہوری اقدامات کرنا چاہتے ہیں۔

دار المصنفین کی مطبوعات

دار المصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے وزارت تعلیم کی جانب سے پچاس ہزار روپیہ کے عطیہ کا اعلان کیا تھا لیکن وزارت تعلیم کی جانب سے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ اتنی ہی رقم دار المصنفین مطبوعات کی ترتیب، طباعت اور اشاعت میں صرف کرے گا تو یہ رقم دے گی۔ دار المصنفین نے یہ شرط منظور کر لی تھی۔ اس کی طرف سے دو سال میں گیارہ جلدوں کی ترتیب و اشاعت کی اسکیم پیش کی گئی جس کو وزارت تعلیم نے منظور کر لیا چنانچہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں دار المصنفین نے حکومت کی شرط کے مطابق مندرجہ ذیل کتابیں شائع کیں۔

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، کشمیر سلاطین دہلی کے عہد میں، عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر میں، اسلام ایک دین رحمت، مقالات سلیمانی، صاحب المثنوی [illegible]۔

(قومی آواز)

خدا بخش میموریل لیکچر کا سلسلہ

پٹنہ۔ خدا بخش میموریل لیکچر کا پہلا سلسلہ ۲۹ مارچ سے اورینٹل پبلک لائبریری کے احاطہ میں شروع ہوا جو تین دن تک کے لیے تھا۔ اس موقع پر مشہور و معروف محقق جناب قاضی عبدالودود نے "دساتیر۔ اس کی ابتدا اور اثرات" کے موضوع پر لیکچر دیے۔

(آزاد ہند، کلکتہ)

گورکی کی سالگرہ

ماسکو۔ ۳۰ مارچ کو گورکی کی سالگرہ کے موقع پر سوویت ادب کا ایک فیسٹیول منعقد ہوا۔ اس میں سوویٹ مصنفین نے قارئین کے بڑے جلسوں سے خطاب کیا۔ یہ فیسٹیول پہلی بار منعقد کیا گیا۔ اس کے بعد ہر سال اس طرح کے فیسٹیول منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(دعوت، دہلی)

آفتاب پانی پتی شاعر خاص

پٹیالہ۔ پانی پت کے ۸۰ سالہ شاعر روپ چند آفتاب کو ہریانہ گورنمنٹ نے ریاست کے شاعر خاص کا اعزاز عطا کیا ہے۔ آفتاب پانی پتی اردو کے [illegible] ہیں۔ زبانوں سے متعلق شعبہ کے ڈائرکٹر نے یہ اعلان کیا۔ ۳۰ مارچ کو ایک تقریب میں آفتاب پانی پتی کو یہ خاص اعزاز دیا گیا۔

(الجمعیۃ، دہلی)

اردو زبان میں حلف اٹھانے والے

دہلی۔ دلی میٹروپولیٹن کونسل کے جن ممبروں نے اردو زبان میں حلف اٹھایا ان کے نام یہ ہیں۔ حافظ عبدالعزیز، مولانا امداد صابری، مسٹر ایف سی سرکار (نامزد) مسٹر اوم پرکاش بہل، مسٹر بی۔ پی دوسوا، چودھری فتح سنگھ اور مسٹر ہیرا سنگھ انور دہلوی نے ہندی زبان میں حلف اٹھایا۔

(الجمعیۃ، دہلی)

مرقع ہند کی نمائش

احمد آباد۔ ماڈرن (گجرات) میں آئندہ مہینہ جو [illegible] بین الاقوامی نمائش منعقد ہوگی۔ اس میں "ایکو آف انڈیا" کے نام سے ایک تصویری مرقع بھی پیش کیا جائے گا۔ یہ مرقع نیشنل ڈیزائن انسٹی ٹیوٹ نے تیار کیا ہے اس کے ذریعہ ہندوستان کی تہذیب کو کثرت میں وحدت کے بنیادی تصور کو تصویری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں لہلہاتے کھیت دکھائے گئے ہیں وہیں تیل اور سب آب و گیاہ میدان بھی پیش کیے گئے ہیں دیہاتی عورتوں کے ساتھ ساتھ کالج کی لڑکیوں کی بھی اس مرقع میں عکاسی کی گئی ہے۔ ڈائرکٹر جناب [illegible] نے جو اس پراجیکٹ کے ایڈیٹر بھی ہیں بتایا کہ یہ مرقع ایک ہزار تصاویر پر مشتمل ہوگا۔ اس مرقع کی ترتیب کا کام تقریباً مکمل ہو چکا۔

(دعوت)

شبیب علی حسین

موج عظیم آبادی

جناب محمد رضا خاں معروف بہ نیا صاحب موج ساکن عظیم آباد پٹنہ نواب محمد حسن خاں رئیس پٹنہ کے اکلوتے فرزند تھے اور مشہور خاندان گزری کے ایک رکن تھے۔ موج ۱۲۸۲ھ میں محلہ گزری شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت و تعلیم ان کے ننہالی محلہ کشمیری کوٹھی میں ہوئی اور عنفوان شباب میں کلہ حاجی گنج میں خان بہادر علی محمد شاد کی بھتیجی سے ان کی شادی ہوئی۔ اسی زمانہ میں ایک واقعہ سے متاثر ہو کر حکیم محمد جواد بھیکہ پوری (ضلع سارن) سے فارسی و عربی کی درسیات کی تکمیل کی۔ حکیم صاحب مفتی محمد عباس لکھنوی کے شاگرد اور پٹنہ میں مطب کرتے تھے۔ شاعری کے ابتدائی شوق میں اپنے والد سے فیض پایا اور پھر شاد عظیم آبادی سے تلمذ ہوا۔ لیکن آخر کار زبردست طبیعت اپنی کاوشیں خود سلجھانے لگی اور مشورہ سے مستغنی ہو گئی۔ بلکہ بعض دوسرے طبیعت داروں کو درست کر دیا۔

موج قوی جثہ مضبوط ہاتھ پاؤں کے شکیل آدمی اور شہزور شخص تھے آنکھیں بڑی اور روشن تھیں صورت سے خوشنمائی، وجاہت اور مدبرانہ متانت نمایاں تھی۔ یکا گندمی رنگ، ستھرا چہرہ اور ہنس مکھ بشرہ تھا۔ طبیعت مجذوب مگر حسین اور تیز تھی۔ حافظہ قوی اور ذہانت نمایاں تھی یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں پاکیزہ مذاقی کے ساتھ خوش مذاقی اور سلاست کے ساتھ لطافت اور رنگینی کا چٹخارا موجود ہے۔ تخیل اعلیٰ مگر انداز بیان صاف دلچسپ ہے۔ زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ موج ذہین اور ذکی الطبع تھے، طبیعت ہمہ گیر لے کر آئے تھے اور جامع کمالات دماغ پایا تھا۔ علمی ذوق کے علاوہ دوسرے اعلیٰ فنون سے بھی لگاؤ تھا۔ فن سپہ گری میں مرزا ابو سعت حسین ماہر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ خوش نویسی کو امیر مرزا رئیس محلہ لودی کٹرہ پٹنہ سے نہایت اصولی اور قاعدہ دانی سے حاصل کیا تھا۔ قینچی اور کاغذ سے گل تراشی، تصویر تراشی اور حرف تراشی (اس طرح جیسے موقلم سے کام لیتے ہیں) خوب کرتے تھے۔ گوکہ موجودہ دور میں فن قرطاسی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ فن بھی اپنے فنکار کے جمالیاتی شعور کی بالیدگی کا بہترین مظہر ہے۔ اب سے نصف صدی پہلے اسے فن کے لحاظ سے کم و بیش وہی درجہ حاصل تھا جو آج کے مستند فنون لطیفہ کو حاصل ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس فن کو خطاطی اور شاعری کا لوازمہ سمجھنا چاہیے۔

موج کو موسیقی سے بھی شوق تھا محض شوق ہی نہیں بلکہ درک بھی حاصل تھا یہی وجہ تھی کہ اکثر و بیشتر وہ موج ترنم کے آثار چڑھاؤ میں بہتے رہتے اور گھنٹوں سر و تال کے گرداب میں پھنسے رہتے تھے۔ طبیعت کے سوز موسیقی کے ساز نے مل کر ان کی شاعری کو اثر آفرینی کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ موج موسیقی کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ مشہور ستار نواز عبد الحسین عرف پیارے نواب صاحب پٹنوی کی صحبتوں میں گھنٹوں پر بھی ہاتھ دوڑتا تھا لیکن یہ شوق آٹھ نو سال رہ کر جاتا رہا کیونکہ علمی ذوق کے دماغ کو موسیقی کی انفرادی دلچسپی کلیتہً جذب نہیں کر سکی کہ دوسرے تمام اعلیٰ رجحانات کو بالکل خیر باد کہہ دے۔ یہ بات اس طور پر اور واضح ہوتی ہے کہ ان سے تمام عمر درس و تدریس اور خوش نویسی کا شغل نہیں چھوٹا۔

موج کی طبیعت رنگا رنگ کا آئینہ تھی۔ جبت مہذب مگر بہت شگفتہ ہوتی تھی ہر رنگ کے چرچے شریفانہ لیکن رنگین انداز میں ہو جاتے تھے۔ وہ بلند حوصلہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالی فکر بھی تھے۔ عربی و فارسی کی ادبیات پر کافی نگاہ تھی۔ چوّن سال کی عمر میں جمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ (مطابق ۱۹۱۷ء) میں قریب شام فالج میں مبتلا ہو کر تین گھنٹے میں تمام ہو گئے اس زمانہ میں محلہ پتھر کی مسجد میں قیام تھا دوسرے دن مقبرہ قلمی منڈی میں (اسٹیشن گلزار باغ سے قریب اور ریلوے لائن سے ملا ہوا ہے) دفن ہوئے مرحوم نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کا دیوان میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

محمد بشیر خاں صاحب (شاگرد موج مقیم گیا) کے پاس چند غزلیں تھیں سوائے ان کے اب موج کا کلام کہیں نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مضمون کے ذریعہ موج کی زندگی اور ان کے کلام کی ایک جھلک پیش کی جائے۔ یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ استاد معظم ڈاکٹر محمد عقیل کا حکم اس مضمون کے لکھوانے کا محرک ہے۔

مرزا احمد حسین یاس عظیم آبادی جو اب یگانہ لکھنوی کر کے مشہور اور اپنی آتش پرستی کی دھن میں اکثر شعرائے لکھنؤ سے غالبانہ اور کامیاب مقابلہ کر چکے ہیں جن کا مشہور کیہ کلام "زبردست نہ زیر دست یاس آتش پرست" لکھنؤ کی ادبی فضا میں مدتوں ہنگامہ برپا کر چکا ہے موج عظیم آبادی کے ہم پیالہ تھے اور بہت کچھ موج مرحوم کے سدھارے ہوئے تھے۔

موج کا انداز بیان اور طرز فکر دبستان عظیم آباد کا ہے جسے لکھنؤ اور دلی اسکول کے امتزاج نے جنم دیا تھا۔

نمونہ کلام:-

جو کچھ خیال تھا مرے دل سے مٹا دیا
وارفتگی نے اور ہی عالم دکھا دیا
تھی دیدنی بہار دل داغ دار کی
باد فراق نے یہ گلستاں جلا دیا
ثابت قدم تھا راہ میں تیری وہی غریب
مانند نقش پا جسے تو نے مٹا دیا
ساقی کے پاؤں پہ مجھے گرنا تو یاد ہے
لیکن میں خود گرا کہ کسی نے گرا دیا

پھول نہ شاخ گل پہ یوں فصل بہار دیکھ کر
باغ میں آشیاں بنا بلبل زار دیکھ کر

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

دیریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

منشی کندن لال شرر سہارنپوری

منشی کندن لال شرر سہارنپوری کے بزرگوں کا وطن سہارنپور تھا اور آپ وہاں کے ایک خوشحال اور اعلیٰ بھٹناگر کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے آپ کے والد منشی جناب رائے تحصیلداری کے عہدے پر فائز تھے لیکن اچانک غازی پور تحصیل میں وفات پائی۔ منشی کندن لال اپنے والد کی وفات تک سہارنپور رہے اس کے بعد اپنے خسر منشی سوہن لال کے پاس گوالیار چلے آئے جو گوالیار میں چیف جسٹس کے عہدے پر مامور تھے منشی سوہن لال صاحب نے شرر صاحب کو گوالیار کے ڈسٹرکٹ جج کے یہاں سررشتہ دار کے عہدے پر تعینات کر دیا اس کے بعد دس بارہ سال تک آپ گوالیار میں سرکاری ملازمت میں رہے لیکن اچانک جنوری ۱۸۸۶ء میں ملازمت کو خیرباد کر دیا اور اپنے وطن سہارنپور میں پھر سکونت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۹ء میں ریاست گوالیار میں پھر آگئے اور آپ نے یہاں وکالت کرنا شروع کر دی اور ۱۹۱۹ء تک ریاست گوالیار ہی میں وکالت کی۔ لشکر ریاست گوالیار میں آپ نے ایک پختہ مکان بنوا لیا تھا اور یہاں ہی ۱۵ ر نومبر ۱۹۱۹ء کو وفات پائی لیکن شیام سندر لال برق ستیاپوری نے اپنی کتاب "بہار سخن" میں دھوکے سے آپ کی تاریخ وفات ۱۹۲۱ء لکھ دی ہے جو غلط ہے۔ اردو کے کسی تذکرے میں ان کے حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا خمخانۂ جاوید" جیسے ہمہ گیر تذکرے میں ان کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ منشی نوبت رائے نظر ، لال شند علی گڑھی کے عزیز اور ان کے قابل ذکر تلامذہ میں سے تھے آپ نے اپنے ادبی رہنما حضرت مشعل کی یاد میں انھیں کے نام پر ایک رسالہ "شعلہ" بھی جنوری ۱۹۰۴ء میں بھیل گڑھ ریاست گوالیار سے نکالا تھا اس رسالے کے تین ابتدائی شمارے میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ رسالہ زمانہ ، ادیب الٰہ آباد انتخاب لاجواب اور مولانا راسخ کے اخبار "ظریف" دہلی میں بھی آپ کا بہت کلام شایع ہوا ہے۔ آپ کی وفات پر منشی دیا نرائن نگم رسالہ زمانہ جنوری ۱۹۲۰ء "ادبی خبروں" میں رقمطراز ہیں۔

> "حضرت شرر سہارنپوری کی بے نظیر نظمیں زمانہ" کی ابتدائی جلدوں کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت ہوا کرتی تھیں پے درپے خانگی اور بعض مکروہات دنیوی نے صاحب ممدوح کو ایک عرصہ تک خاموش کر رکھا تھا افسوس اب مرگ بے ہنگام نے ہم کو ہمیشہ کے لیے آپ کے کلام معجز نظام سے محروم کر دیا۔ وسط نومبر میں حضرت شرر نے لشکر ریاست گوالیار میں انتقال فرمایا جس خوبی کے ساتھ مرحوم نے سنسکرت کے بعض قدیم "قانون کو زمانہ" کی خاطر اردو میں نظم کیا ہے وہ آپ کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہے افسوس آپ کی بے وقت وفات نے ہماری بہت سی امیدوں کو جو آپ کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں ملا دیا۔ اس وفات حسرت آیات سے جو صدمہ عظیم ہوا ہے اس کا نہ اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ تلافی ممکن ہے۔ شرر صاحب پرانی وضع کے بزرگ تھے دوستوں کی حوصلہ افزائی اور اردو رسالوں کی قلمی اعانت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس رسالہ سے آپ کو کس قدر محبت تھی اس کا خیال کرتے ہی دل بیقرار ہو جاتا ہے مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے خدا تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے"

حضرت شرر سہارنپوری کی دو کتابیں مثنوی نیرنگ بیخودی "مثنوی گلزار نسیم" کی بحر میں ہے اس میں ایک ریاکار فقیر کے حالات کو ایک سچے صادق کی دل بستگی سے مقابلہ کرتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ روحانی منزل میں بھی انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔ مسدس موسوم بہ مرقع عبرت" مسدس میں سرمایہ دار نوجوانوں کی شیفتہ مزاجی کا افسوس ناک فوٹو کھینچا گیا ہے۔

اتر پردیش کے شہروں میں سہارنپور ہی ایسا شہر ہے جس نے منشی کندن لال شرر سہارنپوری سے پہلے اردو میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں پیدا کیا۔ سرور جہان آبادی کی طرح شرر سہارنپوری کی نظمیں سارے ہندوستان میں مقبول تھیں۔ اگر ان کی قومی وطنی اور مذہبی نظموں کا ایک انتخاب شایع کر دیا جائے تو کلاسیکل نظموں کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگا۔ رامائن اور مہابھارت کی نظموں کا ہی صرف انتخاب شایع کیا جائے تو دو سو صفحات کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے جس سے اردو کے ان نقادوں اور ادیبوں کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اردو پر اکثر یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ اردو میں رامائن اور مہابھارت کی داستانیں تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم ان کی نظموں کے سلسلے میں زمانہ کے "جوبلی نمبر" میں یادرفتگاں" مقالے میں رقمطراز ہیں۔

> "منشی کندن لال شرر سہارنپوری ، رائے پربھولال حیدرآبادی ، سرور جہان آبادی ، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی ، اور پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی وفات بھی بہت بے موقع ہوئی۔ ان حادثات سے نہ صرف زمانہ ہی کو بلکہ اردو ادب کو بحیثیت مجموعی ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ شرر صاحب کی بہترین نظمیں "زمانہ" کی پرانی جلدوں میں محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر آج بھی ان کی قادر الکلامی کی داد دینا پڑتی ہے۔ آپ کی موجودگی میں جب کبھی ہندو اتہاس (تاریخ) کے متعلق کوئی تصویر رسالہ میں شایع ہوئی تو (باقی صفحہ ۱۰ پر)

غزلیں

نسیم شاہجہانپوری

کھلے ہوئے ہیں شگوفے کہ گریۂ دیدۂ تر
بہار بھی ہے چمن میں خزاں کے زیر اثر

وہ تیری زلف کی شب ہو کہ میرے شانے کا گھر
ہر ایک جلوہ ہے میری نظر میں خندہ نظر

نہ کوئی وعدہ و پیماں نہ کوئی عہد مگر
لگی ہوئی ہے نظر شام ہی سے جانبِ در

نہ جانے راہ میں گم ہو گیا کہاں رہبر
کیا جو غور تو تنہا ہمیں تھے منزل پر

چمن میں لاکھ نشیمن سہی، یقیں ہے مگر
گرے گی برق ہمارے ہی آشیانے پر

چراغِ آخرِ شب ہوں یہ فکر ہی ہے مجھے
کہ میرے بعد نمودار ہو رہی ہے سحر

دلِ حزیں میں ہے بے نام سی خلش اب تک
زمانہ گزرا کہ ٹکرائی تھی نظر سے نظر

یہ مشتِ خاک ہے اک رازِ سینۂ کونین
کوئی سمجھ نہ سکا آج تک مقامِ بشر

بتا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں مجھ کو
گزر رہی ہے جو کچھ کائنات کے دل پر

قدم قدم پہ یہ رک رک کے سوچتا ہوں میں
کہ ابتدائے سفر ہے کہ انتہائے سفر

نسیمؔ شب کے چراغوں کو یوں ہی جلنے دو
کہ اعتبار کے قابل نہیں ہے نورِ سحر

ظہور رضوی برقؔ

ان سے اظہارِ غم و درد بھی کرنے نہ دیا
وقت پر کام مرے قلب و جگر نے نہ دیا

زندگی کی مجھے خواہش جو ہوئی جینے کا
مرنا چاہا تو تری یاد نے مرنے نہ دیا

ٹوٹ جائے نہ کہیں دستِ جنوں کی زنجیر
آپ نے گیسوئے برہم کو سنورنے نہ دیا

اب بھی شاداب ہیں دل میں تری یادوں کے گلاب
لذتِ درد نے ان زخموں کو بھرنے نہ دیا

برقؔ خوں رونے پہ بھی کم نہ ہوئی تیرہ شبی
کون سا غم کہ جو دیدۂ تر نے نہ دیا

ڈاکٹر کلیم بدایونی

غمِ دنیا یہ کہتے ہیں مجھے ہوش نہیں
میں ترے غم سے ہی اے دوست سبکدوش نہیں

اتنا تو یاد ہے چلمن کو ہوئی تھی جنبش
کب گری برقِ تجلی یہ مجھے ہوش نہیں

سازِ جذبات کا ہر تار شکستہ ہی سہی
نغمۂ شوق مگر آج بھی خاموش نہیں

جانے کیا کر دیا ساقی کی نظر نے جادو
ابھی ساغر کی تمنا تھی ابھی ہوش نہیں

التفاتات ایسے کہ بھی جتا دیں ورنہ
نظر آتا کوئی بھی انساں ہم آغوش نہیں

آج کیا بات ہے کھوئی گھٹائیں ہیں اداس
کیوں وہ لہرائی ہوئی زلف بردوش نہیں

اب بھی چونک اٹھتا ہوں گل کی سی تجلی پہ کلیمؔ
خود فراموش ہوں، جلوہ فراموش نہیں

ہمایوں ظفر زیدی

فصلِ گل کا عجیب ساماں ہے
دشت وحشت ہے اور گریباں ہے

اب کہاں خوئے گیسوئے جاناں
ہم ہیں ہستی کی زلفِ پیچاں ہے

دل ہے اور دل کی خانہ ویرانی
نہ کوئی آرزو نہ ارماں ہے

اب ملے گی وفا کی قیمت کیا!
خونِ آدم بھی جب کہ ارزاں ہے

کیا رہا اب سوالِ تشنہ لبی
چشمِ ساقی بھی جب پشیماں ہے

گردشیں تو محیط ہیں ہر سو
زندگی ہے کہ پھر بھی رقصاں ہے

حالات وہی

پورن کمار ہوشؔ

پھر وہی شکوہ ہے ہونٹوں پہ تمہارے اے دوست!
"زندگی خشک ہے، بے رنگ ہے، بے ذائقہ ہے
ایسے حالات میں جینے کا کوئی لطف نہیں
ایسا ماحول ہے اک بوجھ دماغ و دل پر
کشمکش، یاس، پریشانی، گھٹن، محرومی
زندگی اپنے لیے اس کے سوا کچھ بھی نہیں"

تم نے اے دوست مگر غور کیا ہے اس پر
زندگی آج سے بہتر بھی کبھی تھی کہ نہیں
زندگی مخزنِ اسبابِ مسرت کب تھی؟

چند حالات و حوادث ہیں، مواقع ہیں فقط
زندگی جن کے الٹ پھیر کا افسانہ ہے
زندگی آج بھی ہے کل بھی یہی تھی ورنہ

سارے حالات موافق ہوں ضروری تو نہیں
یہ بھی لازم نہیں ہر لمحہ خوشی ہی لائے
منحصر ہم پہ ہے حالات پہ حاوی ہو کر
ایک اک مشکلِ ہستی سے کریں لطف کشید
آگ کے شعلوں سے چاہیں تو نچوڑیں شبنم
چوس لیں شہد بھی کانٹوں سے اگر چوس سکیں
ورنہ ہر حال میں جینے پہ قناعت کر لیں

ارتقا کا ڈیلٹا

مظفر حنفی

لالچی دریا نے،
چٹانوں کے ٹکڑے،
گھاٹیوں کے سنگریزے،
خشک میدانوں کی مٹی،
الغرض جو بھی خس و خاشاک آیا راہ میں
سب کو دامن میں سمیٹا
اور نادانستگی میں،
اپنی منزل کے بہت نزدیک آ کر،
راستے سے ہٹ گیا۔

صفحہ ۴ سے آگے

آپ ہی سے اس پر نظم لکھنے کی فرمائش کی جاتی تھی آپ بھی ہمیشہ ہماری درخواست گرم جوشی سے قبول فرماتے تھے اس دوستانہ نوازش کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ آپ نے تمام زندگی بھی ہماری درخواست کو رد نہیں کیا۔ اب بھی آپ کی بعض نظمیں پڑھ کر بے اختیار یاد آتی ہے اب بھی بزم زمانہ میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اب بھی آپ کی قوم آپ کا ماتم کر رہی ہے۔ آج آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن آپ کا دلکش کلام ہمارے دلوں کو مسرور کرنے کو اب بھی باقی ہے۔ اور جلد یا دیر کبھی نہ کبھی کتابی صورت میں شایع ہوگا اور بعض عناصر سے لے کر ہم سے اہم عنوانوں پر آپ نے نہایت شگفتہ نظمیں لکھی ہیں جن کی بدولت آپ کا نام عرصہ تک یادگار زمانہ رہے گا۔"

شرر سہارنپوری اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ستیہ وان اور ساوتری کے قصہ کو مسدس میں نومبر ۱۹۰۹ء میں نظم کیا تھا۔ یہ نظم مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ یہ مسدس "زمانہ" جنوری ۱۹۰۹ء میں شایع ہوا تھا اور پھر دفتر "زمانہ" ہی سے فروری ۱۹۰۹ء میں اس کا کتابچہ شایع ہوا تھا۔ اس مسدس میں چھتیس (۳۶) بند ہیں۔ مسدس کی ابتدا کرتے ہوئے شاعر ہندوستان کی تعریف میں چار بند پیش کرتا ہے۔

محسود زمانہ تھا کسی وقت میں بھارت　　ہر خطۂ عالم میں تھی اس نام کی شہرت
شاہان جہاں رشک کیا کرتے تھے حسرت　　ہاں اس پہ کبھی فخر کیا کرتی تھی عظمت
انسان جنھیں چاہیے کہنا وہ نہیں تھے
رتبہ میں سرافراز فرشتوں سے کہیں تھے

مولد تھی یہ پاکیزہ زمیں صدق و صفا کی　　تاثیر تھی تقدیس فزا آب و ہوا کی
نورانی نظر آتے تھے اس خاک کے خاکی　　سینہ تھا اگر صاف تو دل مرجع پاکی
دنیا پہ نہ ڈالیں کبھی الفت کی نگاہیں
پڑتی تھیں ہر اک شے پہ حقیقت کی نگاہیں

بھارت ہی میں پیدا ہوئے وہ اہل بصیرت　　کثرت میں نظر آیا جنھیں جلوۂ وحدت
یاں ہوتی تھی کچھ ایسی گذر اہل حقیقت　　نظارہ میں جلوت تھی تصور میں تھی خلوت
عالم بھی ہر اک علم میں تھے فرد یہاں کے
ست دھرم پہ قائم تھے زن و مرد یہاں کے

سچوں کے تھے سرتاج ہرشچندر سے راجا　　فیاض زمانہ ہوئے بل کی طرح داتا
ارجن سے دلاور ہوئے اور بھیم سے جودھا　　تھیں پاک نفس دیویاں یاں کی پتی ورتا
وہ شان تھی اس قوم کی عظمت کے سبب سے
رہتے ہیں ابھی تک مہ و خورشید ادب سے

* ساوتری کے آدرش کو ذہن نشین رکھتے ہوئے یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

ساوتری بھی طبقۂ نسواں میں تھی مشہور
جس کا کہ دل پاک محاسن سے تھا معمور
رشک مہ و خورشید ضیائے رخ پرنور
ہاں! روبرو میلا تھا کف پا کے رخ حور
وہ پاک نفس حسن و لطافت کی تھی دیوی
وہ شرم و حیا عفت و عصمت کی تھی دیوی

تھا اہل حشم اشوپتی راجۂ مدرا
فرزند نرینہ سے تھا محروم تمنا
پیری کا عصا، اور بوڑھاپے کا سہارا
بیٹی ہی ماں باپ کی تھی آنکھ کا تارا
تھا کلبۂ تیرہ اسی خورشید سے روشن
دل رہتا تھا اسی شعلۂ امید سے روشن

تھی اپنی نظیر آپ وہ دوشیزۂ گلرو
سرو چمن قدس تھا اس کا قد دلجو
آراستہ تھی علم کے زیور سے وہ خوشخو
پاکیزہ خیالات تھے عادات تھی نیکو
صورت کو بہر طرح تھا سیرت پہ تفاخر
سیرت کو بہر طور تھا صورت پہ تفاخر

"زمانہ" فروری ۱۹۱۵ء میں حضرت شرر سہارنپوری کی "خاک" پر ایک دلاویز نظم شایع ہوئی ہے جس کا پہلا بند یہ ہے۔

تجھ پہ سو جان و دل فدا اے خاک
کہ جھلکتا ہے تجھ میں جلوۂ پاک
ہاں! ظہور وجود ہے تجھ سے
اس جہاں کی نمود ہے تجھ سے
تجھ کو رتبہ ملا ہے پستی کا
ہے تجھی پہ مدار ہستی کا
سامنے ہے یہ جتنی موجودات
اصل اس کی ہے ایک تیری ذات
نظر آتے ہیں مختلف اجسام
ایک تو ہے ہزار تیرے نام
تجھ سے بننا ہے ہست ہو جانا
تجھ میں ملنا ہے نیست کہلانا
خاکساری ہے تیری طینت میں
انکسار اور عجز خلقت میں
آسمان دیکھنے میں ہے بالا
مرتبہ تیرا عرش سے اعلیٰ
تو ہے الحق مظہر عالم
آسمان جھک کے لے رہا ہے قدم

تیرے دھنوں کا وہ کرے اظہار
ذرہ ذرہ کیا ہو جس نے شمار

"فصل زمستان" پر آپ کی نظم "زمانہ" ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی ہے۔ چند بند ملاحظہ فرمایئے موسم سرما کی تصویر ہو بہو کھینچ دی ہے۔

فصل سرما نے الٹ دی روئے دنیا سے نقاب
عارض روشن کی پھیلی دھوپ بن کر آفتاب
ایک ہی نظارہ میں اے نازنین بے نقاب
سنسنی دل میں ہے رعشہ دست و پا میں بے حساب
اس ادا کے ساتھ تو جلوہ آرائی ہوئی
دفعتاً حیرت سے دیکھ کر چشم تماشائی ہوئی

ہے قیامت کا ترا انداز شوخ جامہ زیب
پھوٹ نکلا ہے رعنائی سے بھی حسن دلفریب
چاک ہیں ہاتھوں سے تیرے صبر کے داماں و جیب
تاپنے کا طرز ہے آتش زن تاب و شکیب
زندگی ہجراں نصیبوں کے لیے دشوار ہے
سرد مہری کی قیامت گرمی بازار ہے

سر بسر اعجاز ہے نیرنگ حسن دلنواز
چھوٹے چھوٹے دن ہیں طرز جلوہ آرائی کے ناز
ہیں یہ لمبی لمبی راتیں تیری گیسوئے دراز
منظر صبح و مسا ہیں سحر چشم ساز
سرد الفت کی مگر دل میں ذرا گرمی نہیں
سنگ دل ایسی بھی کیا سختی ذرا نرمی نہیں

چھا گئی عالم پہ تزئین گر بہار دل پذیر
کر رہے ہیں ناز برداری تری برنا و پیر
یوں گزرتی ہے جگر سے موج باد زمہریر
پار ہوتے ہیں نگاہ ناز کے جس طرح تیر
دیکھ کر انداز شوخی شباب فصل کے
آہ یاد آئے کسی کے جھوٹے وعدے وصل کے

نور کا تڑکا وہ کچھ کچھ کہر سے چھایا ہوا
لے رہی ہے دل کے پہلو میں خبر ٹھنڈی ہوا
گل ہوئے ہیں جلوہ آرا بن کر رنگیں قبا
نخل بھی ہیں سر سے اوڑھے سبز مخمل کی ردا
پتیوں میں ناز سے کلیاں سمٹ کر رہ گئیں
قامت شمشاد سے بیلیں لپٹ کر رہ گئیں

دشت گلچیں ہے فسردہ دور ہے خار رقیب
خواب میں صیاد ہے جاگے ہیں بلبل کے نصیب
مرحبا وقت مبارک حبذا وصل حبیب
جلتی ہے آتش گل سے کلیجہ عندلیب

بیٹھے ہیں ڈالے پروں میں چونچ مرغان چمن
ہاتھ بغلوں میں دبائے ہیں نوجوانان چمن

ایک چھوٹی سی نظم "بستر علالت" ملاحظہ فرمایئے۔ یہ نظم آپ نے اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھی۔

بستر علالت۔

گردش دوراں! ستم ہے ظلم کی بانی ہوئی
آہ ہائے ناگہاں یوں دشمن جانی ہوئی
منظر ارض و سما نظروں میں وحشت خیز ہے
خانہ ویرانی سی ہے خانہ ویرانی ہوئی
کیا خبر تھی ہوں گے ایام علالت ختم یوں
جانستان آب و ہوائے عالم فانی ہوئی
ایک ہفتہ میں کمی آئی غذا و ہضم میں
رفتہ رفتہ ضعف کی بے حد فراوانی ہوئی
میں نے جب پوچھا کہا گھبراؤ مت اچھی ہے جی
میری بیماری سے آپ کیسی پریشانی ہوئی
ہائے وہ بے چینیوں کے ساتھ شب بیداریاں
خواب مرگ کو فکر تن آسانی ہوئی
اڑ گئی تسکین خاطر سے گئے صبر و قرار
دل میں جمعیت جو تھی وقف پریشانی ہوئی
اس تن نازک کے ہائے! [illegible]
دیدہ گریاں سے جیب و دامن افشانی ہوئی
کاتب تقدیر نے جو کچھ ازل میں لکھ دیا
وہی ہوتا ہے شمر یہ بات جانی ہوئی

مراسلات

کلیم الدین احمد بحیثیت شاعر اور نقاد

ہماری زبان، مورخہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر وحید اختر کا کلیم الدین احمد کی "بیالیس نظمیں" پر ایک تبصرہ شایع ہوا ہے۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۶۷ء کے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اس تبصرے میں پیش کیے گئے خیالات کا تجزیہ کیا ہے اور کہا ہے "یہ ایک غیر تنقیدی حربہ ہے جسے مختلف وجوہ سے کچھ لوگ دیدہ و دانستہ استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اس پر خواہ مخواہ تنقید کا رنگ و روغن چڑھا رہے ہیں۔" ۸ر فروری ۱۹۶۷ء کے ہماری زبان میں محمد افصح صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے کلیم الدین کی نظموں کے رنگ و آہنگ پر بڑے دلچسپ اور معلوماتی انداز میں روشنی ڈالی ہے اور وحید اختر کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے باوجود ان کے پورے تبصرے کو "طنز اور لفظی بیترا بازی کا آمیزہ" بتایا ہے۔ میری حقیر رائے میں وحید اختر نے جو باتیں اپنے تبصرے میں کہی ہیں وہ قرین صواب ہیں۔ انھوں نے صرف کلیم الدین کی "۴۲ نظمیں" کا ہی جائزہ نہیں لیا ہے بلکہ تمام ممکن زاویوں اور پہلوؤں سے نظم گوئی پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک حق پسند نقاد کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں انھوں نے وسعت و گہرائی اور توازن و اعتدال کی کسی حد کو مس کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ تخلیق سے متعلق نظم کی جو معیاری خصوصیات ممکن ہیں ان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ ایک بلند معیار کے نقد و تبصرہ کے لیے ذہن جس توازن و تعادل (EQUILIBRIUM) کو چاہتا ہے اس کے بخشنے میں فطرت بڑی بخیل واقع ہوئی ہے لیکن مجھے یہ ظاہر کرنے میں قطعاً تامل نہیں کہ نئی نسل میں وحید اختر بھی منجملہ ان چند نفوس کے ہیں جو قدرت کے اس عطیہ خاص پر عرفی کی زبان میں کہہ سکتے ہیں۔

دراں دیار بہ سودا روند و کم کردہند
جوئے طال بہ عمر ابد بہ لبیاری

گوئٹے کا یہ خیال کہ ایک اچھے شاعر کے لیے نقاد ہونا بھی ضروری ہے وحید اختر کی ناقدانہ بصیرت سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے تبصرے میں کلیم الدین کی دنیائے نقد و نظر میں بلند نگاہی کا بڑی فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ ان کے تبصرے کا آغاز ہی اس جملے سے ہوتا ہے "پروفیسر کلیم الدین احمد ہمارے ان ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے تنقیدی سرمائے میں خاصا اضافہ کیا ہے اور ان کے انداز نقد و نظر سے اختلاف کے باوجود ان کے وسیع مطالعے، محنت اور باریک بینی کا اعتراف نہ کرنا بے جا ہوگا۔"

مجھے حیرت ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے یہ عبارت تو اپنے تجزیے میں درج کر دی

"اگر کوئی اور شاعر ہوتا تو ہم رسمی طور پر تبصرہ کر کے اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے لیکن کلیم الدین صاحب نے الخ"۔

لیکن اس سے اوپر والی عبارت جس میں وحید اختر نے کلیم الدین صاحب کو نظم سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات کا حامل قرار دیا ہے اسے کیوں نظر انداز کر دیا۔ وحید اختر نے لکھا ہے۔

"میں نظم (مختصر / طویل) کا یہی مفہوم سمجھتا ہوں کلیم الدین صاحب انگریزی ادبیات کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ان کی نظر زیادہ وسیع اور نظم کے تقاضوں یا آداب سے زیادہ آشنا ہے۔ نظم کی کوئی بھی تعریف کی جائے یا اس کا کوئی بھی تصور کیا جائے وہ بیشتر نظم نگار شاعروں سے زیادہ انھیں سمجھنے اور پرکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں پھر ان کے سامنے انگریزی زبان میں نظم کا وسیع تنوع اور ہر لحاظ سے قابل قدر سرمایہ بھی ہے اس لیے وہ اردو کی شاعری اور بالخصوص نظم پر تنقید کرتے ہوئے ان تمام معیاروں اور بلندیوں کو سامنے رکھ کر حکم لگاتے رہے ہیں جن کی تکمیل میں ہماری نظم اپنی نارسائی اور ناپختگی کا اعتراف کرتی ہے۔"

کیا اس اعتراف کے بعد بھی کوئی انصاف پسند قاری ڈاکٹر ابو محمد سحر کی زبان میں کہہ سکتا ہے کہ وحید اختر "تنقید میں ان کی (کلیم الدین کی) سخت گیری اور انتہا پسندی کے خلاف دل کا بخار نکالنا" چاہتے ہیں۔

جہاں تک کلیم الدین صاحب کی تنقید میں سخت گیری اور کٹرپن کا تعلق ہے اس کی کسے شکایت نہیں۔ ان کے انداز تنقید کی "تیغ ناز" جو انتہا پسندی کے زہر میں بجھی ہوئی ہے آج تک کسی بڑے سے بڑے شاعر اور نقاد کو معاف نہ کر سکی ؎

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق باز باز کشی

ان کی دو کتابیں "اردو شاعری پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" دیکھنے کے بعد ان کی غیر معمولی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے مشرق کو مغرب کی عینک لگا کر دیکھا ہے مجھے ڈاکٹر ابو محمد سحر کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ

"ناقد کے لیے تخلیقی عمل کی نوعیت اور مراحل سے واقفیت ضروری ہے اسی طرح شاعر کو بھی تنقیدی بصیرت کا مالک ہونا چاہیے۔ لیکن دونوں کا میداں الگ الگ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر اچھا ناقد اچھا شاعر ہوتا اور ہر اچھا شاعر اچھا ناقد۔"

مرحوم نیاز فتح پوری کی بھی ایسی ہی کچھ رائے ہے

"آپ یہ سن کر غالباً حیرت کریں گے کہ انتقادی ذوق شعر گوئی سے بالکل علاحدہ چیز ہے یہاں تک کہ ایک بہترین شاعر بھی اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھا نقاد ہے میر کو دنیا خدائے سخن مانتی ہے لیکن جب یہ خدائے سخن خود اپنے کلام کا انتخاب کرتا ہے تو وہ پیغمبری کے درجہ سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے اور خود اسے متعلق خبر نہیں ہوتی کہ اس کے بہترین اشعار کون سے ہیں۔"

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے مراسلے میں اس مسلمہ اصول کا استثنا یہ کہہ کر پیش کیا ہے

"کچھ اچھے ناقد اچھے شاعر یا اچھے شاعر اچھے ناقد ہو سکتے ہیں۔"

وحید اختر صاحب کی اگر کوئی غلطی ہے تو وہ یہی کہ انھوں نے کلیم الدین صاحب کو بھی اس استثنا کا مستحق سمجھ لیا اور بنا بریں ان سے "بجا طور پر" توقع کرنے لگے کہ

"اگر وہ نظم کے میدان میں قدم رکھیں گے تو ان کی تخلیق کاوشیں اردو نظم کی بے مائگی کے لیے سرمایۂ فخر، نظم کی ہیئت اور فن کے تقاضوں سے بے خبر شاعروں کے لیے ایک مثالی نمونہ اور کم پڑھے لکھے روایتی انداز میں شاعری کرنے والوں کے لیے گہرائی، بلاغت اور معنویت کا درس ہوں گی۔"

میرے خیال میں وحید اختر نے اپنے تبصرے میں کلیم الدین کی شخصیت، معلومات اور ان کے تنقیدی نظریات کو پیش نظر رکھا ہے اور ہربرٹ ریڈ کی طرح انھوں نے اردو میں نفسیاتی تنقید کا ایک سیدھا سادا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے اس مختصر مگر جامع تبصرے کو دیکھ ہربرٹ ریڈ کا وہ جملہ یاد آجاتا ہے جو نفسیاتی تنقید کی دنیا میں بہت مشہور ہے۔

"میں رفتہ رفتہ تنقید کے اس رجحان کی طرف راغب ہوتا جاتا ہوں جسے نفسیاتی تنقید کہتے ہیں کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ شاعر کی شخصیت شاعری اور شاعری کی تکنیک کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

I have been gradually drawn towards a psycholo-gical type of literary criticism, because I have realised that psychology more parti-culaly the method of psycho-analysis, can offer explanations of my problems connected with the technique of poetry and the appre-ciation of the poem (collected essays)
P-B

(شمس طہرانی۔ ریسرچ فیلو شعبۂ فارسی علی گڑھ)

"م" کے استفسار پر

جناب 'م' نے ۸ر جون ۱۹۷۵ء کے "ہماری زبان" میں چند فارسی اشعار سے متعلق استفسار فرمایا تھا جس کے جواب میں میں نے ۸ر فروری ۱۹۷۶ء کے "ہماری زبان" میں دو شعروں سے متعلق لکھا تھا اور درج ذیل شعر

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم رہرو انست مرا

کو مرزا مظہر جانجاناں سے منسوب کیا تھا دراصل یہ شعر مرزا غالب کی اس غزل کا ہے جس کا مقطع ہے۔

رہرو تفتہ دررفتہ بہ آہم غالب
توشۂ برلب جو ماندہ تشانست مرا

حوالے کے لیے دیکھیے "کلیات غالب" (در مطبع خاص منشی نول کشور) صفحہ ۲۵۸

(انیس نور الحسن انور ادیب)

یہ شعر غالب ہی کا ہے۔ ادارہ ہماری زبان۔

ہندی والوں کو راجہ جی کا مشورہ

مدراس ۔ راجہ جی نے ہندی کے حامیوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اردو کے بارے میں زیادہ لچک دار رویہ اختیار کریں ۔

ہفتہ وار "سوراجیہ" کے تازہ شمارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ عوام کے درمیان ایک مشترک زبان کی حیثیت سے ہندی کا مستقبل شاندار ہے شرط یہ ہے کہ ہندی والے اردو سے ایک زیادہ لچک دار رویہ اختیار کریں اور ایسی زبان ایجاد کرنے کی کوشش سے پرہیز کریں جو ہندی گھروں میں نہیں بولی جاتی ہے بلکہ صرف ہندی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی ہے ۔

راجہ جی نے لکھا ہے کہ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے اسکو ریاستوں اور مرکز کے درمیان خط و کتابت کی زبان ہونا چاہیئے سرکاری زبان کے سوال پر شک اور الجھن دور کرنے کے لیے پنڈت نہرو کی یقین دہانیوں کو باضابطہ شکل دے دینا چاہیئے ۔ (قومی آواز)

صرف ہندی میں !

دہلی ۔ دلی کی میٹرو پولیٹن کونسل کا اجلاس شروع ہو رہا ہے اس موقع پر چیف ایگزیکٹو کونسلر جناب ملہوترا نے دلی کے شہریوں کے نام ایک پیغام نشر کیا ۔ دلی ایڈمنسٹریشن نے اس تقریر کو پریس نوٹ کی صورت میں صرف ہندی رسم خط میں اخبارات کے دفتر میں بھیجا ۔ یہ پہلا موقع ہے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے کوئی پریس نوٹ محض ہندی میں جاری کیا گیا ۔ اس سے قبل انگریزی اور اردو میں بھی پریس نوٹ آتے رہے ہیں ۔ (الجمعیۃ)

عدالتی زبان کے معاملے میں جوش کے بجائے سوجھ بوجھ کی ضرورت

احمد آباد ۔ ہندوستان کے چیف جسٹس جناب بار راؤ نے عدالتی زبان کے مسئلہ کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس معاملہ میں سوجھ بوجھ کو کام میں لایا جانا چاہیئے جوش کو نہیں انھوں نے کہا کہ قانونی غور و فکر اور قانونی اظہار کے لیے سچائی لازمی شرط ہے ۔

جناب بار راؤ نے بتایا کہ انگریزی ضابطۂ قانون کے حوالوں اور تجربوں نے قانونی اسلوب کو آسانی سے سمجھ میں آنے والا مواد فراہم کیا ہے اس بارے میں ہماری زبانوں کو انگریزی زبان کی سطح پر پہنچنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے اس لیے جلد بازی کی کوئی بھی کوشش قانون سازی اور وکالت دونوں کے منافی ہوگی ۔

ہندوستان کے چیف جسٹس نے مزید کہا کہ جلد بازی ہمیں فلسفۂ قانون کے علمی دھارے سے بھی الگ تھلگ کر دے گی ۔

انھوں نے کہا کہ عدالتوں میں مختلف زبانیں رائج کرنے سے ہمیں اپنی زبانوں کی اصطلاحات کو یا تو اپنے طور پر یا باہر سے کارآمد الفاظ مانگ کر مالا مال کر لینا چاہیئے جبکہ اگلی نسل قانون کے کالجوں کے اندر قومی زبانوں میں پڑھ کر فارغ ہو چکے گی ۔

چیف جسٹس نے کہا کہ میں اپیل کرتا ہوں چاہے لوگوں کی طرف سے مجھے غلط سمجھے جانے کا خطرہ مول لینا ہی کیوں نہ پڑے کہ آپ ایسی غلطی ہرگز نہ کیجیے جس کا مداوا بعد میں نہ ہو سکے ۔ (الجمعیۃ)

دو ریاستوں میں اردو عدالتی زبان کی حیثیت میں استعمال ہوتی ہے

نئی دہلی ۔ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے جو اطلاعات وزارت امور داخلہ کو موصول ہوئی ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ اردو صرف دو ریاستوں کی عدالتوں میں استعمال ہوتی ہے یہ دو ریاستیں ہیں جموں و کشمیر اور آندھرا پردیش ۔ جموں و کشمیر میں اردو ماتحت عدالتوں میں اور ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کی عدالتوں میں استعمال کی جاتی ہے ۔ فیصلوں ڈگریوں اور احکامات کے لیے اردو اور انگریزی دونوں کا استعمال ہوتا ہے آندھرا پردیش میں اردو ان زبانوں میں سے ایک ہے جو تلنگانہ کے علاقہ کی ماتحت عدالتوں میں استعمال ہوتی ہے یاد رہے کہ تعزیرات ہند کی ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۵۵۸ اور ضابطہ دیوانی کی ۱۳۷ کے ماتحت ریاستی حکومتوں کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ دیوانی اور فوجداری کے ماتحت عدالتوں اور ہائی کورٹ میں کون سی زبان استعمال ہونی چاہیئے ۔ (الجمعیۃ)

چودہ علاقائی زبانوں کو مساوی حیثیت دینے کا مطالبہ

مدراس کیرالا کے وزیر اعلیٰ ای ۔ ایم ۔ ایس نمبودری پد نے زبان کے مسئلہ پر اب دراوڑ منیترا کڑاگام کے موقف کی کھل کر حمایت کی ہے اور تریوندرم میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ تمام علاقائی زبانوں کو یکساں درجہ ملنا چاہیئے ۔

نمبودری پد نے کہا ہے کہ ہندوستان جیسے کئی زبانوں والے ملک میں لسانی اور ثقافتی گروہوں کے وجود کو تسلیم نہ کرنا خطرناک بات ہوگی ۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی کو ہٹا کر اس کی جگہ ہندی کو ملک میں رابطہ کی زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کی تجویز نے سخت دشواریاں پیدا کر دی ہیں ۔ تمام قومی زبانوں کے لیے مکمل مساوات ہونی چاہیئے ۔

دراوڑ منیترا کڑاگام سب کی سب چودہ علاقائی زبانوں کو برابر کا درجہ دیئے جانے کی حامی ہے اور ہندی کو ملک میں رابطہ کی واحد زبان بنانے کی مخالفت کرتی ہے ۔

(سیاست کانپور)

اردو ہندی ادب کے عصری مسائل

الٰہ آباد میں مجلس مصنفین کی کانفرنس

گزشتہ دنوں یہاں مجلس مصنفین کی دو روزہ کانفرنس بحسن و خوبی تمام ہوئی۔ اس کانفرنس میں ملک کے مختلف حصوں سے ہندی اور اردو ادیب شریک ہوئے۔ کانفرنس کا موضوع عصری ہندی اردو ادب کے مسائل تھا اور اس کے انعقاد کا اہتمام ہندی اردو ادیبوں کی انجمن "پرگتی" نے کیا تھا۔

پہلی نشست:- موضوع ادب عصری حالات کے تناسبات میں۔ شری سمترا نندن نے اپنے افتتاحی مضمون میں کہا کہ اب عصریت ایک وسیع موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی مروجہ تعریف بدل چکی ہے اور مختلف نظریوں اور معیاروں کی جدوجہد میں عالمی اقدار نے دوسری شکل اختیار کر لی ہے۔ مغربی خیالات نے اکیلاپن اور انفرادیت کے تصورات کو ابھار دیا ہے اس لیے سماجی و ذاتی نقطۂ نظر کی یکجہتی کی ضرورت ہے۔ پروفیسر اے۔ بی۔ بھٹناگر نے تاریخ اور ادب کے دیرینہ رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عصری ماحول کو اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ قلم بند کرنے کی صلاحیت موجودہ ادب میں نہیں ہے کیونکہ اس نے عوام کی زندگی اور زبان کو ترک کر دیا ہے۔ جناب بشر نواز نے کہا کہ شاعر اپنے ذاتی تجربات کو جس گہرائی کے ساتھ پیش کر رہا ہے اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر ظل حسنین نے ترقی پسند تحریک کی زوردار لفظوں میں تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بڑی اور جاندار تحریک اردو ادب کی پوری تاریخ میں نظر نہیں آئے گی۔

ادیبوں کو نئی اور ادب کو زندگی کے قریب لانا چاہیے۔ ان کو دنیا میں پھیلی ہوئی سامراجیت، سرمایہ پرستی اور کولونزم کے خطروں سے لڑنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ انسانیت کا پیامبر ہوتا ہے۔ شری امرت رائے نے عالمی سیاسی مسائل کی ترجمانی کے لیے ادیب کو متوجہ کیا اور ڈاکٹر رام کمار ورما نے آنکھ بند کر کے پروپیگنڈے کے رجحانات سے محفوظ رہنے کی تلقین کی۔ فراق گورکھپوری نے کہا کہ جب تک ہندی یا اردو کے ادیب ملک کے عوام کی زبان قبول نہیں کرتے اس وقت تک ادب کھوکھلا رہے گا اور ہندوستانی ذہن پر اس کا اثر خاطر خواہ نہیں ہو سکے گا۔

خطبۂ صدارت دیتے ہوئے شری مہادیوی ورما نے کہا کہ اردو اور ہندی کے ادیب یکجا ہو کر باہمی مسائل پر غور کر رہے ہیں یہ بجائے خود ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی ادیب عالمی انسانیت کے تقاضوں سے پہلوتہی کرتا ہے تو اسے ادیب کے بجائے کلرک کہنا چاہیے جس کا مقصد نقل کرنا ہے۔

دوسری نشست:- موضوع۔ اصناف ادب ہیئت اور ترکیب۔ افتتاح بحث کرتے ہوئے شری الاچند جوشی نے عصری ادب کے چند بنیادی سوالوں کی طرف اشارے کیے۔ انھوں نے کہا کہ کہانی، ناٹک، شاعری وغیرہ میں عقیدے اور جذبے کی قلت کا احساس ہوتا ہے جو غیر ادب کی طرف لے جانے کا باعث ہے۔ رام لعل نے قاری اور مصنف کے باہمی تعلق پر زور دیا اور کہانی کی بنیادی خصوصیت اس کی دلچسپی میں مضمر قرار دیا۔ کہانیوں میں دلچسپی کو ترک کر کے شدید الجھنوں کو بنیادی جگہ دی گئی ہے۔ اور شمس الرحمٰن فاروقی نے شاعری کی ہیئت اور ترکیب کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اس سلسلہ میں سنجیدگی کا اظہار نہیں ہوگا ادب کا صحیح راستہ متعین نہیں ہو سکے گا کیونکہ ادب لفظوں کی ترتیب گری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ڈرامے کی ہیئت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مسیح الزماں نے عالمی ڈراموں کے اہم رجحانات کا ذکر کیا۔

جناب شہریار نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے پرانے ادیبوں کے رویہ پر اظہار تشویش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے ادب کو سمجھنے کے لیے آج کے مزاج کو سمجھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر جگدیش گپت نے اپنے خطبے میں جدید کو ضرورت کے مطابق بدلتے رہنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا کہ نئے انسان کو کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

تیسری نشست:- موضوع:- ادبی تنقید کے نئے معیار۔ مجلس مصنفین کی تیسری نشست کی صدارت جناب فراق گورکھپوری نے کی۔ افتتاح بحث کرتے ہوئے پروفیسر پرکاش چندر گپت نے نقد ادب کے لیے ایک غیر جانبدار رویہ پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ صرف اعلیٰ فنکارانہ صلاحیت سے ادب جنم نہیں لیتا بلکہ انسانی اقدار اور تجربات کے ذریعہ اس کی تخلیق ہوتی ہے۔ جناب ایت کا رستے ناقد اور مصنف کے باہمی تعاون پر زور دیا اور ڈاکٹر محمود الحسن نے ناقد کی فنکارانہ ذمہ داریوں پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ انحطاط پذیر ادب کی ترویج کی امید رکھنا ناقد سے بے ایمانی کی خواہش کرنا ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے اپنے مضمون میں ذاتی تجربوں کی انفرادیت کی اہمیت پر زور دیا اور بدلتے ہوئے حالات میں ادب کے تقاضوں پر دوبارہ غور کرنے کی دعوت دی۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے شری بال کرشن راؤ نے ناقدوں کے عقائد کو سرمایہ داری کا پروردہ قرار دیا۔ ساتھ ہی جدید تنقید کے لیے معیاروں کی ضرورت پر زور دیا اور محمود عثمانی نے ذاتی تجربہ کو سب سے بڑا معیار قرار دیا۔ شری امرت رائے نے ترقی پسندوں کی جانبداری کی شکایت کی۔ پروفیسر احتشام حسین نے کہا کہ ناقد کو غیر ضروری قرار دینے کے بعد بھی اس کی تلاش کی ضرورت ہے۔ فراق گورکھپوری نے کہا کہ وقت کی زبان میں گفتگو کرنے کی بنا پر بعض ادیبوں نے عوام سے تعلق ختم کر لیا ہے۔ ادب کا رشتہ زندگی سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔

چوتھی نشست:- موضوع۔ تخلیقی قدریں عصری ادب کے سلسلہ میں۔ افتتاح بحث کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین نے کہا کہ ادیب شاعر اپنے خیالات و جذبات کے مطابق ہی تشکیل ادب کرتا ہے لہٰذا تخلیقی قدریں بھی اسے لازمی طور پر متاثر کرتی ہیں ادیب قدروں کی تخلیق نہیں کرتا لیکن اپنی تخلیق میں اسے محفوظ کرتا ہے سماج اس کی تخلیقات کے ذریعہ قدروں سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اسی رابطہ سے زندگی کے معیار متعین ہوتے ہیں۔ جناب شہریار نے جدیدیت کو ادب کی اولین شرط قرار دی اور کہا کہ سماج و ادب کا تعلق اس کے خارجی اثرات کی بنا پر ہے۔ ڈاکٹر ظل حسنین نے ادب کی بنیادی خصوصیت انسانی اقدار کی ترجمانی میں مضمر قرار دیا۔ اور جناب بشر نواز نے جدید اردو شاعری کی طرفداری کرتے ہوئے اس کی فکری خصوصیات کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ قدریں اپنے دور تک محدود ہوتی ہیں لہٰذا ان پر بحث نہیں ہونی چاہیے۔

بحث میں حصہ لیتے ہوئے ملیالم کے مصنف شری کے۔ دامودرن ایم۔ پی نے کہا کہ قدریں تمام تر تغیر پذیر نہیں ہوتیں۔ عام انسانی قدریں ہزاروں برس کی ریاضت سے حاصل ہوتی ہیں۔ جدید ادیب کو ان کے لیے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

خطبۂ صدارت دیتے ہوئے شری الاچند جوشی نے کہا کہ قدروں کی مخالفت میں جدید ادیب کی جھلاہٹ اور غصہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

جلسہ کا خاتمہ کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر جعفر رضا کے اظہار تشکر کے بعد ہوا۔

(ظفر آزاد)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں "جدیدیت اور ادب" کے موضوع پر سہ روزہ سیمینار

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام جدیدیت اور ادب کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمینار آج شروع کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاحی جلسہ ۳۱ مارچ کو تین بجے آرٹس فیکلٹی کے لاؤنج میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں ہندی کے ممتاز ادیب و شاعر جناب ایس ایچ۔ واتسائن اور اردو کے مشہور صاحبانِ قلم ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس اور شمس الرحمٰن فاروقی، بلراج کومل، رام لعل کے علاوہ شعبۂ اردو کے اساتذہ اور یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ نے شرکت کی۔

سب سے پہلے صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور نے ایک مختصر سی تعارفی تقریر فرمائی جس میں موصوف نے ادب اور جدیدیت کے مسئلہ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا اور سیمینار کی اس خصوصیت کا ذکر کیا کہ اس میں اردو ادیبوں اور نقادوں کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی کے ممتاز اہلِ قلم کو بھی مدعو کیا گیا ہے تاکہ ان زبانوں کے ادیبوں کو دورِ حاضر میں جن مشترک مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کا حل تلاش کرنے میں بھی اشتراکِ عمل سے کام لیا جا سکے۔

پروفیسر سرور کی مختصر تقریر کے بعد پرو وائس چانسلر جناب محمد فضل الرحمٰن صاحب نے سیمینار کا افتتاح فرماتے ہوئے اپنا فاضلانہ خطبہ پیش کیا جس میں زندگی میں جدیدیت کے مفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا کہ ادب چونکہ زندگی کا آئینہ دار ہے اس لیے زندگی کی طرح اس میں بھی انقلاباتِ زمانہ کے ساتھ مناسب تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور نہ صرف موضوع اور مواد میں بلکہ ہیئت اور اسلوب میں بھی جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ آگے چل کر موصوف نے بڑی خوش اسلوبی اور وضاحت کے ساتھ ان تجربوں کا بھی ذکر فرمایا جو جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں کیے گئے۔ اسی سلسلے میں اس پہلو پر خاص زور دیا گیا کہ ادب چاہے قدیم ہو یا جدید اس میں فنی خوبیوں اور جمالیاتی قدروں کا پایا جانا لازمی ہے۔ پھر جہاں تک ادب میں مقصدیت کا سوال ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ ادب محض وقت گزاری و دماغی تفریح یا ادنیٰ جذبات کی تسکین کا آلۂ کار نہ ہو بلکہ اس کے ذریعہ فرد و قوم کی ذہنی اصلاح اور جذباتی تربیت کا سامان مہیا کیا جائے۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے فرمایا کہ کسی ادیب کی تخلیق میں جتنی گہرائی ہوگی اتنی ہی اس کی جدیدیت دیرپا ہوگی۔ خطبے کے آخر میں جدید اردو ادیبوں اور شاعروں کے اس ذہنی انتشار اور تخیلی بحران کا شکوہ بھی کیا گیا جو مبہم پیرایۂ بیان اور پیچیدہ تشبیہات اور استعارات کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا گیا کہ یہ کیفیت ناگزیر ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی جب تک خود زندگی اپنی راہیں دریافت نہ کر لے۔

پرو وائس چانسلر صاحب کے خطبے کے بعد جدیدیت کی تعبیر و تشریح میں دو مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ جناب یوسف جمال خواجہ صاحب استاد شعبۂ فلسفہ نے پیش کیا۔ اس مقالے میں انھوں نے جدیدیت کے فلسفیانہ پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے جدید اور جدیدیت کے الفاظ کی تشریح کی اور جدیدیت کو زندگی کے مختلف شعبوں میں روایتی اقدار کے بجائے تازہ عصری اقدار کی جانب ایک رجحان سے تعبیر کیا۔ آگے چل کر مقالے میں خوب سے خوب تر کی تلاش اور اقدار کا تجزیہ کیا جو گذشتہ تین صدیوں میں نشوونما پاتا رہا ہے اور جس کو عصرِ جدید کا مزاج یا جدیدیت کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جمال خواجہ صاحب کے بعد شعبۂ فلسفہ کے ایک دوسرے استاد ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا جس میں بتایا گیا کہ جدیدیت کو دو طرح سے سمجھا جا سکتا ہے، ایک تو مسلسل ترقی پذیر عمل کی صورت میں، دوسرے ایک نظامِ اقدار کی تشکیل یا عرفان کی صورت میں۔ اس مقالے میں زور دیا گیا کہ عصرِ حاضر کی جدیدیت کو سمجھنے کے لیے سائنسی رویے، نئی اقدار کی تلاش، معروضیت اور انفرادیت کے ان عناصر کو سمجھنا ضروری ہے جو اس جدیدیت کی تشکیل میں کارفرما ہیں۔ مقالہ نگار نے جدید ادب پر کیے جانے والے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا جن کو شکست، تنہائی، مزاج، غیر ضروری آزادی اور سماجی و سیاسی مسائل سے بے تعلقی کا نام دیا جا رہا ہے۔

ان مقالات پر ڈاکٹر دیوراج، ڈاکٹر ثریا حسین، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب خلیل الرحمٰن اور جناب شکور سعید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس بحث کے بعد جناب واتسائن صاحب نے جدیدیت کے موضوع پر ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ جدیدیت کے مسئلے کو مارکسی یا ایلیٹ کے پس منظر میں حل کرنے کی کوئی کوشش ہم کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ انھوں نے فرمایا کہ جدیدیت کا سوال روایت سے وابستہ ہے اور روایت کو یکایک ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں جدید ادیبوں اور شاعروں سے اس بات کی شکایت بھی کی گئی کہ وہ آنکھ بند کر کے روایت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتے ہیں جو کسی طرح درست نہیں۔ واتسائن صاحب نے اپنی تقریر میں اس تضاد کی طرف بھی اشارہ کیا جو ہماری عقلی اور جذباتی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایک طرف ہم سائنسی طریقۂ فکر کا پرچار کرتے ہیں تو دوسری جانب ہم جذباتی طور پر خود کو روایات کے شکنجے میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جدیدیت کے مسئلے پر غور و فکر کرتے وقت اس تضاد کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے اور وہ طریقے تلاش کیے جائیں جن سے ہماری عقلی اور جذباتی زندگی میں ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا ہو سکے۔

یہ جلسہ ساڑھے سات بجے برخاست ہوا۔ (باقی آئندہ)

صفحہ ۲ سے آگے

چہرۂ یار دیکھ کر صبح بہار دیکھ کر　　آئی ہے یاد وصل کبھی اور کبھی منزلِ بہار
بڑھ گئی دل کی تشنگی نقش و نگار دیکھ کر　　لائق دید ہے نہ تھی شکلِ مرقعِ جہاں

ابھی ایک دشمن میں رہتے کبھی یوں بھی کالی کر　　تری جستجو میں نکلے مجھے یوں تلاش کرتے

نشّۂ شوق سے انساں اگر خیال کرے　　ایک انقلاب ہے اپنی جگہ پہ ہر ذرہ

پہنچے ہزار پردۂ حائل کے ساتھ ہیں　　آنکھوں میں جلوہ گر ہیں وہ دل کے ساتھ ہیں
یہ شوخیاں جو پردۂ محمل کے ساتھ ہیں　　شاید سبب ہے حسرتِ مجنوں کی جذب و ار

موصوف کے مذکورہ دیوان میں کچھ رباعیاں اور چند مثنویاں بھی ہیں جن کا مطالعہ ایک خاص ادبی حیثیت رکھتا ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپا کر اور پبلشر نذیر احمد چندر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا